
چشم تماشا
ہاشم علی خان ہمدم
ALEX

بسم الله الرحمن الرحيم

چشمِ تماشا

نواں مجموعۂ کلام

ہاشم علی خان ہمدمؔ

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام
https://archive.org/details/@nzkiani
nzkiani@gmail.com

تعارف

نام : ہاشم علی خان ہمدؔم

تاریخ پیدائش : ۷؍جولائی ۱۹۷۳ء

تعلیم : ایم اے اردو، ایم اے انگریزی، بی ایڈ (پنجاب یونی ورسٹی لاہور)

جائے پیدائش : خودہ شریف تحصیل حسن ابدال ضلع اٹک

پیشہ : درس وتدریس

سرکاری ملازمت : اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ

ادبی خدمات : بانی و منتظم موج غزل ادبی فورم (فیس بک)

اصناف سخن : حمد، نعت، غزل، نظم، سلام، منقبت، طنز و مزاح

تصانیف : ۱۔ موجِ کرم (حمد و نعت)

۲۔ پانچواں موسم (غزلیات)

۳۔ آئینہ سچ بولتا ہے (غزلیات)

۴۔ موج غزل (طرحی غزلیات)

۵۔ محبت کی زباں (طرحی غزلیات)

۶۔ دھوپ کی دیوار (طرحی غزلیات)

۷۔ چراغِ فکر (طرحی غزلیات)

۸۔ جہانِ خواب (طرحی غزلیات)

۹۔چشم تماشا (طرحی غزلیات)

۱۰۔سراب سے آگے (طرحی غزلیات)

۱۱۔تیسرے کنارے پر (طرحی غزلیات)

۱۲۔نمودِ سحر (طرحی غزلیات)

۱۳۔آدھا سفر (طرحی غزلیات)

۱۴۔دم (منتخب دیوان)

۱۵۔آخری چراغ (غزلیات)

۱۶۔طرحی غزلیات (زیرِ طبع)

۱۷۔نظموں کا مجموعہ (زیرِ طبع)

۱۸۔نعتیہ نظموں کا مجموعہ (زیر طبع)

۱۹۔نعتیہ مجموعہ (زیر طبع)

۲۰۔مزاحیہ کلام (زیرِ طبع)

پتہ : خودہ شریف، تحصیل حسن ابدال ضلع اٹک ۔

فون نمبر : 0311-5509555

انتساب

عزیزازجان
والدین،بہن بھائیوں
بیوی بچوں،عزیزوں
اساتذہ
دوستوں
اور
چاہنے والوں کے نام

فریبِ چشمِ تماشا میں دور جا نہ سکے
سرائے خواب سے آگے دیا جلا نہ سکے

عالمی ادبی فورم کے بہتّر سے ایک سو اڑتیس مشاعروں میں کہا گیا کلام

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام	چشمِ تماشا۔
شاعر	ہاشم علی خان ہمدمؔ۔
وضاحت	یہ ہاشم علی خان ہمدمؔ کے کلام کا نواں مجموعہ ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

صفحات	۱۵۳
سالِ اشاعت	ستمبر ۲۰۲۳ء
ہدیہ	دعائیں۔
پبلشر	مکتبۂ ارمغانِ ابتسام۔ اسلام آباد، پاکستان۔
برقی ڈاک	itshamdam@gmail.com
ارکائیو ربط	archive.org/details/@nzkiani

فہرست

پیشرس

پاک ہے وہ ذات جس نے انسان کو شعور دیا کہ وہ باطنی اور ظاہری آنکھ سے داخلی اور خارجی کائنات کا مشاہدہ کرے اور عین کے پردے میں نہاں غینی حجاب سے آشنا ہو کر اپنے آپ کو پالے۔ خود آ گاہی کا رستہ ہی مشاہدۂ حق کا رستہ ہے۔ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا؛ اس نے رب کو پہچان لیا۔ کسی عارف نے یوں کہا تھا:

من تو شدم، تو من شدی، من جاں شدم، تو تن شدی
تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم، تو دیگری

(میں تو بن جاؤں، تو میں بن جا، میں جاں بن جاؤں، تو جسم بن جا۔۔۔ تا کہ بعد میں کوئی یہ نہ کہہ سکے، میں کوئی اور ہوں، تو کوئی اور ہے)

خود شناسی کے سفر میں تیسرا کنارہ، تصویر کا تیسرا رخ، موسیقی کا آٹھواں سر، پسِ آئینہ دوسرا آدمی، آٹھواں آسمان، روشنی کا آٹھواں رنگ، پانچواں موسم اور تیسری آنکھ روشن ادراک کی علامتیں ہیں۔ چشمِ تماشا بصیرت افروز ہو تو آئینہ سچ بولتا ہے اور آ گہی کے آخری چراغ تک روشنی کے پھول کھلتے رہتے ہیں۔

ادب زندگی کا نمائندہ ہے جس میں تہذیب، ثقافت، رسم و رواج، زبان، لباس، مزاج، خوراک، رہن سہن، سماجی روابط اور معاشرت کے تمام رنگ پائے جاتے ہیں۔ ادبی فن پارہ اپنے تکنیکی، فنی، لسانی، سماجی اور آفاقی کردار کو نبھاتے ہوئے دل میں اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثبت رویوں کا فروغ ادبی بالیدگی اور تہذیبی ترقی ہے۔ مایوسی اور منفی سوچ سے پہلو تہی کرتے ہوئے اچھے اور خوب صورت لہجے میں پاکیزہ، اعلیٰ اور

ارفع خیالات کا اظہار خوب صورت ادب ہے۔ آفاقی محبت، فطرت سے لگاؤ، خلوص اور انسان دوستی ، امن اور اخوت کا پہلو ادب کا آفاقی منصب ہے۔

عالمی ادبی فورم کی بنیاد خوب صورت شاعر شعیب نویؔد خان نے رکھی۔ مجھے اس کے پہلے ایک سو اڑتیس مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ بہ طور منتظم اور میزبان میرے لیے بہت اچھا تجربہ رہا۔ شعیب نویؔد خان بہت اچھے انسان اور دوست ہیں۔ اس فورم میں اچھے شعرا کے ساتھ کام کا موقع ملا۔ خوب صورت مصرعوں پہ ہفتہ وار مشق سخن سے بہت کچھ سیکھا۔ اس فورم پہ کہی گئی غزلیات ''جہانِ خواب'' اور ''چشمِ تماشا'' کے عنوان کے تحت اشاعت پزیر ہیں۔ حمدیہ اور نعتیہ کلام حمد و نعت کے مجموعے میں شامل ہے۔ شعیب نویؔد خان نے اس فیس بک ادبی فورم کو باقاعدہ ادبی تنظیم کی شکل دی اور ملک کے مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ مجھے عالمی ادبی فورم واہ چیپٹر کی نظامت کا اعزاز حاصل ہے۔ عالمی ادبی فورم کے زیر اہتمام کئی مشاعرے منعقد کیے جا چکے ہیں۔ میں عالمی ادبی فورم کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

زیر نظر شعری مجموعہ ''چشمِ تماشا'' عالمی ادبی فورم کے بہتر سے ایک سو اڑتیسویں مشاعرہ تک کہی گئی غزلیات پر مشتمل ہے۔ جس کی برقی اشاعت کا اہتمام موج غزل کے منتظمین نوید ظفر کیانیؔ اور روبینہ شاہین بیناؔ صاحبہ نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادبی سفر میں ہمیں کامیاب اور بامراد فرمائے۔ آمین

نوائے حرف میں ہو روشنی عطا یا رب!
ہمارے بعد زمانہ ہمیں بھلا نہ سکے

ہاشم علی خان ہمدمؔ
۱۳/اگست ۲۰۲۳ء

☆

فریبِ چشمِ تماشا میں دور جا نہ سکے
سرائے خواب سے آگے دیا جلا نہ سکے

عجیب رنگ میں لپٹے تھے کانچ کے پیکر
ہم آئنے کا فسانہ کبھی سنا نہ سکے

وہ مصلحت کا جہاں تھا مگر نجانے کیوں؟
ہوا کی پیاس بجھاتے دیے، بجھا نہ سکے

اُنہی کا ذکر، اُنہی کا سراغ، اُن کا غم
عجیب لوگ تھے یادوں سے دور جا نہ سکے

ہمارے ساتھ رہا ہے شعور کا سایہ
ہجومِ شہر سے دامن کبھی بچا نہ سکے

ہمارے ہاتھ میں کوزہ گری رہی لیکن
ہم اپنے خواب کا پیکر کبھی بنا نہ سکے

وہ کج روی تھی ، انا تھی ، کہ کج کلاہی تھی
کہ جن کو حشر اٹھانا تھا، سر اٹھا نہ سکے

نوائے حرف میں ہو روشنی عطا یا رب!
ہمارے بعد زمانہ ہمیں بھلا نہ سکے

ہمیں بھی قید کیا ہے اسیر لمحوں نے
ہم اپنے حصے کی صدیاں کبھی بتا نہ سکے

ہم اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں آئینہ
زمانے بھر کو دکھانا تھا جو دکھا نہ سکے

پڑے تھے خار مسلسل ہمارے رستے میں
جہاں پہ پھول کھلانے تھے ہم کھلا نہ سکے

چراغ ہم نے جلائے تھے اس لیے ہمدم
ہمارے بعد اندھیروں پہ رنگ آ نہ سکے

☆

پیش منظر بھی سرِ خواب سنوارا جائے
آئینہ رات کے چہرے پہ اتارا جائے

میں کسی خاص قبیلے کا نسب رکھتا ہوں
مجھ کو اپنوں میں نہ غیروں میں شمارا جائے

خشک پتے ہیں کہیں دھول اُڑی پھرتی ہے
موجۂ گل سے خزاؤں کو بہارا جائے

آستینوں میں پلا مار نہیں بچ سکتا
عین ممکن ہے مرے ساتھ ہی مارا جائے

جس کو دیکھے سے نگاہوں کو قرار آتا ہے
دل کی دھڑکن میں وہی نام پکارا جائے

کتنے دھبے ہیں مرے شہر کی دیواروں پر
ظلمتِ شب کو اجالوں سے نکھارا جائے

مجھ کو ساقی نے پکارا ہے عجب نظروں سے
کیسے آنکھوں کو سرِ بزم خمارا جائے

راستہ زیست کا دشوار ہوا جاتا ہے
کیسے بگڑی ہوئی عادت کو سدھارا جائے

کب مرے ہجر کے آنسو کو اماں ملتی ہے؟
میری آنکھوں سے کہاں ٹوٹ کے تارا جائے

اپنی ہستی کو بھی شطرنج پہ لا بیٹھا ہوں
جان جائے نہ مگر جان سے پیارا جائے

مجھ کو تعبیر سے مطلب نہیں لیکن ہمدم
میری آنکھوں سے کوئی خواب گزارا جائے

☆

کسی نظر نے جو دیکھا ٹھہر ٹھہر کے مجھے
ہوا نے چوم لیا ہے سنور سنور کے مجھے

شبِ وصال میں پھر سے وجود پاؤں گا
کہ ہجر چاٹ رہا ہے کتر کتر کے مجھے

میں برگ برگ کو پھر سے نہال کر دوں گا
پکارتے ہیں جو سائے شجر شجر کے مجھے

کلی کلی کو خبر ہے کہ باغباں میں ہوں
کھلیں جو پھول وہ دیکھیں نکھر نکھر کے مجھے

اُنہیں سمیٹ رہا ہوں مدار کے اندر
جو زاویے نظر آئے نظر نظر کے مجھے

میں کیسی راکھ بدن میں اٹھائے پھرتا ہوں
بدن سلگتے ملے ہیں شرر شرر کے مجھے

یہ دوریوں کا بہانہ ہے یا تعلق ہے
وہ یاد آنے لگا ہے بِسر بِسر کے مجھے

میں ایک عمر، سمندر کا خواب کیا دیکھا
ڈبو رہے ہیں تھپیڑے بھنور بھنور کے مجھے

میں ایک بار ہی بولا تھا تیرے لہجے میں
سو چھیڑتی ہیں ہوائیں بکھر بکھر کے مجھے

میں خشک جھیل تھا لیکن کبھی کبھی ہمدم
فلک سے چاند ملا ہے اتر اتر کے مجھے

☆

جانِ الم ہوئے کبھی اہلِ کرم ہوئے
انسانیت کے نام پہ کیا کیا ستم ہوئے

جگنو ملے، چراغ ملے، آگہی ملی
روشن وفا کی راہ میں نقشِ قدم ہوئے

خونِ جگر سے حرف کی حرمت دوام کی
قرطاس کے امین تو اہلِ قلم ہوئے

دونوں کے بیچ فاصلہ کچھ بھی نہیں رہا
آئینۂ خیال میں ہم یوں بہم ہوئے

کچھ تو شبِ وصال کی امید سی لگی
کچھ تو دیارِ ہجر کے آزار کم ہوئے

پہلے خدا کے نام سے جوڑے گئے صنم
آباد اس کے بعد یہ دیر و حرم ہوئے

بین السطور آج بھی ہمدم سوال ہے
وعدے ہوئے کہ پیچ کے ٹوٹے بھرم ہوئے

☆

زندگی کا سوال ہو جیسے
سانس لینا کمال ہو جیسے

ایک پیکر اجال رکھا ہے
حسنِ ماہِ جمال ہو جیسے

بانجھ لگتی ہے سرزمینِ وطن
کوئی قحط الرجال ہو جیسے

بولنے پر زبان کٹتی ہے
خامشی ایک ڈھال ہو جیسے

دیکھیے کب نصیب ہوتا ہے
وہ بھی طوطے کی فال ہو جیسے

لہلہاتی ہے کھیت میں سرسوں
موسمِ گل بحال ہو جیسے

مسکراتا ہوا دسمبر ہے
میری خوشیوں کا سال ہو جیسے

دل بھی یادیں نہال رکھتی ہیں
ہجر میں بھی وصال ہو جیسے

جان جاتی ہے وقت سے پہلے
آگہی بھی وبال ہو جیسے

خود فریبی عذاب ہے ہمدم
ہر قدم مور چال ہو جیسے

☆

دِل کے صحرا میں دور جانے لگے
راستے میں سراب آنے لگے

کب سے تالاب پر گئے ہی نہیں
خود کو دیکھے ہوئے زمانے لگے

ایسے ہم زاد کی تلاش رہی
دیکھتے ہی جو مسکرانے لگے

ہم نے سیکھا نہیں جفا کرنا
جانے کیوں لوگ آزمانے لگے

داستاں تھی جدا جدا لیکن
لوگ سارے مجھے فسانے لگے

میری انگلی کو تھام کر بچے
میرے حصے کا بوجھ اٹھانے لگے

راس آیا ہے وحشتوں کا سکوں
ہم بھی جنگل میں گھر بنانے لگے

یہ بصیرت ہے یا ضرورت ہے
شہر اجڑے ہوئے بسانے لگے

زخم پائے طلب کے تازہ ہوئے
خار زاروں پہ رنگ آنے لگے

واقفِ حال تھے مگر غم خوار
میرے قصے مجھے سنانے لگے

روشنی ہم تلاش کیا کرتے
بے چراغی میں دل جلانے لگے

خواب زادوں کو کیا ہوا ہمدم
آئینے سے نظر چرانے لگے

☆

یخ بستگی کی لہر میں دھڑکن ٹھٹھر گئی
تم کیا گئے کہ دِل پہ قیامت گزر گئی

اک بے خودی عجیب سی آنکھوں میں بھر گئی
آئینۂ خیال میں تصویر کر گئی

جب سے ترے خیال کو مصرع بنا لیا
خوشبو کی شاعری مرے دل میں اتر گئی

لپٹی ہوئی ہے راہ بھی مجھ سے قدم قدم
منزل مرے جنون کی شدت سے ڈر گئی

پہلے تو خواب خواب نے پاگل کیا مجھے
پھر یوں ہوا کہ خواہشِ دنیا ہی مر گئی

آوارگی کے شہر سے گاؤں میں لوٹ کر
برسوں کے بعد زندگی اپنوں کے گھر گئی

خوشبو بھرا پیام تھا پھولوں کے ہاتھ میں
موجِ صبا کے دوش پہ دل کی خبر گئی

خواہش کا سائبان تھا سر پر تنا ہوا
تاروں کے آسمان سے آگے نظر گئی

میں بھی کسی خیال میں دیکھے گیا اسے
دِیوار پر گمان کی صورت ٹھہر گئی

ہمدم طلوعِ اشک سے آنکھیں چمک اٹھیں
سورج کی دھوپ کیا مری پلکوں پہ دھر گئی

☆

آئینہ زادفسانے سے گزر جاتے ہیں
خواب زدگی سے نکلتے ہیں تو گھر جاتے ہیں

گردشِ وقت کی تلخی سے بھی خوف آتا ہے
وقت کا ساتھ نبھاتے ہوئے ڈر جاتے ہیں

کج کلاہی میں کہاں اوج نصیب ہوتا ہے
اپنی اوقات سے گرتے ہیں جو مر جاتے ہیں

گھر کی دیوار پہ جلتے ہیں ستارا بن کر
اور آنگن میں سلگتے ہوئے مر جاتے ہیں

یہ تعلق تو مودّت سے بھی آگے تک ہے
جانے کیوں لوگ محبت سے مکر جاتے ہیں

زرد رکھتی ہیں کہاں ہجر کا موسم آنکھیں؟
خشک جھیلوں میں کئی خواب اتر جاتے ہیں

دھوپ نگری کے مسافر ہیں ہمارا کیا ہے؟
شام ڈھلتے ہی کہیں اور ابھر جاتے ہیں

اس لیے موت بھی لازم ہے سبھی پر لوگو!
دل لگاتے ہیں جہاں بارِ دگر جاتے ہیں

سرد موسم سے بچاتے ہیں جو خود کو ہمدم
سرد لہجے کی مروت سے ٹھٹھر جاتے ہیں

.

☆

تعبیر کی کتاب میں آیا نہیں ہنوز
وہ خواب جس کو ہم نے بھلایا نہیں ہنوز

گھر میں سبھی دیے ہیں پرانے جلے ہوئے
ہم نے کوئی چراغ جلایا نہیں ہنوز

رکھی ہوئی ہے ذہن میں جنت خیال کی
کشمیر تجھ کو ہم نے بسایا نہیں ہنوز

میرا وجود ہے کہیں باہر پڑا ہوا
میں خود کو خاکدان میں لایا نہیں ہنوز

زندہ ہے شہرِ خواب میں یادوں کی روشنی
نقشِ خیالِ یار مٹایا نہیں ہنوز

خوشیاں کسی حساب میں تفریق ہوگئیں
لیکن غمِ حیات گھٹایا نہیں ہنوز

خواہش کے آسمان پہ پہلی اڑان ہے
پھر بھی ہوا میں خود کو اڑایا نہیں ہنوز

صبحِ طرب کا رنگ تو پردے میں ہے ابھی
ظلمت زدہ چراغ بجھایا نہیں ہنوز

صیّاد کی نگاہ میں آیا ہوا ہوں میں
حالانکہ اس نے جال بچھایا نہیں ہنوز

گارا بنا کے چاک پہ رکھا گیا مگر
کوزہ گروں نے مجھ کو بنایا نہیں ہنوز

یہ کیا کہ پھر قیام کا پیغام آ گیا
سجدے میں سر جھکا کے اٹھایا نہیں ہنوز

دنیا سرابِ دشت میں کھوئی رہی مگر
رستہ کسی نے دل کو دکھایا نہیں ہنوز

ہمدؔم ابھی شعور کو مصرع نہیں ملا
شاید میں رنگ میرؔ کا لایا نہیں ہنوز

☆

پیشِ منظر جو آئینہ رکھنا
اپنے اندر بھی در کھلا رکھنا

یاد آنے کا سلسلہ رکھنا
دھڑکنوں سے بھی رابطہ رکھنا

تیرگی سے گریز لازم ہے
گھر میں جلتا ہوا دیا رکھنا

دھوپ نگری میں ساتھ چلتا ہے
خود کو سائے سے آشنا رکھنا

ہجر دریا ہے اور اس کا چلن
دو کناروں میں فاصلہ رکھنا

حرف ادراک سے نکلتا ہے
شعر کہنے کا حوصلہ رکھنا

اپنی عینک سے دیکھنے والے
کچھ بصیرت کا ذائقہ رکھنا

اُٹھ رہی ہے جو ذہن میں دیوار
اِس میں چھوٹا سا طاقچہ رکھنا

کون ہے جو وفا نبھاتا ہے
دِل کے دریا میں کیا گھڑا رکھنا

قربتیں امتحان ہیں ہمدم
رکھ رکھاؤ کا دائرہ رکھنا

☆

پیشِ نظر سراب سے آگے گیا نہیں
لیکن خرد جنون میں حد سے بڑھا نہیں

غنچہ کھلا نہیں کوئی بنجر زمین میں
وہ حبس ہے کہ شہر میں تازہ ہوا نہیں

بیٹھا رہا میں دیر سے ہجراں کی دھوپ میں
سایہ ترے وجود کا مجھ پر ڈھلا نہیں

میں بے کنار عشق ہوں مجھ پر یقین کر
سوہنی ! مرے چناب میں کچا گھڑا نہیں

گھرے تعلقات میں جدت شعار ہوں
بندہ روایتی ہوں مگر بے وفا نہیں

دیکھا تجھے تو دیکھتے! بس دیکھتے رہے
یادوں کی بازگشت میں کچھ بھی سنا نہیں

بانگِ درا سنوں تو مری آنکھ بھی کھلے
شورِ سگاں میں ایک بھی سچی صدا نہیں

دستار پر غرور نہ قامت پہ ناز ہے
بونا قدوں کے شہر میں لیکن جھکا نہیں

جینا پڑے تو عشق میں مرنا قبول ہے
اِس دائمی حیات میں کوئی مرا نہیں

پھیلی ہے روشنی مرے احساس کے دروں
جلتا ہوا شعور ہے ہمدم دیا نہیں

☆

خود شناسی عطا نہیں کرتا
ہم سخن آئینہ نہیں کرتا

کچھ نہ ہونا عجیب لگتا ہے
ہوتے ہوتے ہوا نہیں کرتا

میری سوہنی ! چناب میں اکثر
پار کچا گھڑا نہیں کرتا

آستینوں سے وار کرتا ہے
گھر کا دشمن لڑا نہیں کرتا

سر جھکانے سے فائدہ کیا ہے؟
دل جو سجدہ ادا نہیں کرتا

میں پکاروں تو آن ملتا ہے
ہجر کی انتہا نہیں کرتا

بھول جا اور اسے بھی جینے دے
کام کیوں یہ دلا ! نہیں کرتا

فرض اپنا نبھائے رکھتا ہوں
میں کسی سے گلہ نہیں کرتا

جس دیے کو ہوا نہیں لگتی
طاقچے میں جلا نہیں کرتا

کچھ تو ہوتا ہے کوچہ ٔ جاں میں
شور یوں ہی اٹھا نہیں کرتا

شب سلگتی ہے میرے بستر پر
مجھ پہ سورج ڈھلا نہیں کرتا

شعر سچی کمائی ہے ہمدم
حرف کیا کچھ عطا نہیں کرتا

☆

تری تلاش میں نکلوں تو کیا نکل آئے
دیارِ دِل میں نیا سلسلہ نکل آئے

ہوا کے ہاتھ پہ رکھی ہے روشنی میری
میں طاقچے کو پکاروں، دیا نکل آئے

بھٹک رہا ہے مرا قافلہ سرِ منزل
دعا کرو کہ کوئی راستہ نکل آئے

بس ایک بار گلِ دل کو دیکھ لیں آنکھیں
پھر اس کے بعد بھلے موتیا نکل آئے

جواز ڈھونڈ رہے ہیں مفاد کے کھوجی
کوئی اصول، کوئی ضابطہ نکل آئے

حیا کے رزق پہ بیٹی کو پالنے والو!
عجب نہیں کہ کوئی فاطمہ نکل آئے

یہ داستانِ محبت ہے دھیان میں رکھنا
بعید ہے کہ کوئی بے وفا نکل آئے

یہ ممکنات کی دنیا میں عین ممکن ہے
گماں سے بڑھ کے کوئی رابطہ نکل آئے

کلام ہم بھی کریں گے زبانِ غالب میں
صدائے میر اگر ہم نوا نکل آئے

یہی شکست کی آواز ہے سرِ محفل
بہ وقتِ اشک اگر قہقہہ نکل آئے

پنپ رہا ہوں مردف زمین میں ہمدم
اسی نمو میں کوئی قافیہ نکل آئے

☆

خاک دانی میں کہاں تھے پہلے
لامکانی میں گماں تھے پہلے

نالہ ء دل کی زباں تھے پہلے
ہم نوا سنجِ فغاں تھے پہلے

اب کہاں ہیں وہ جہاں تھے پہلے
ہم سخن ، روحِ رواں تھے پہلے

اب کہاں ہوں گے نجانے لوگو!
جانے والے جو یہاں تھے پہلے

یہ محبت کا ثمر لگتا ہے
ہم کہاں اہلِ زباں تھے پہلے

اب چراغوں میں جلے ملتے ہیں
ورنہ ہم لوگ دھواں تھے پہلے

مار ڈالا ہے ستم زادوں نے
وہ بڑھاپے میں جواں تھے پہلے

موجۂ گل نے بہارا مجھ کو
پات میرے بھی خزاں تھے پہلے

آئینہ سنگ سے ایجاد ہوا
رنگ پانی میں کہاں تھے پہلے

ریزہ ریزہ ہیں غمِ ہجراں سے
ٹوٹنے والے چٹاں تھے پہلے

شکر ہے کوئی تو بے دار ہوا
جاگنے والے سگاں تھے پہلے

اب تری یاد کی یکتائی ہے
دل کے مندر میں بتاں تھے پہلے

جب خسارے پہ نفع ملتا تھا
سود مندی میں زیاں تھے پہلے

ہیں جو دریا کی کہانی ٹیلے
کچی مٹی کے مکاں تھے پہلے

گرد پاؤں سے لپٹتی ہے اب
تیز قدموں کے نشاں تھے پہلے

اپنے کردار سے آئے ہمدم
ہم کہانی میں کہاں تھے پہلے

☆

اور پھر کنارے سے لوٹ کر نہ آنے میں
دیر کتنی لگتی ہے کشتیاں جلانے میں

اس لیے پرندوں نے دشت میں قدم رکھا
ہجرتیں ضروری ہیں بستیاں بسانے میں

عمر ہی بسر کر دی ، سنگ دل ہواؤں نے
اک دیا بجھانے میں، اک دیا جلانے میں

زندگی کے کوزے میں جان رکھنی پڑتی ہے
خون دینا پڑتا ہے، دل کو دل بنانے میں

زخم زخم پوروں میں الجھنوں کا ریشم ہے
کس کا ہاتھ شامل ہے ڈوریاں ہلانے میں

دوریاں مٹانے میں ایک ہجر کاٹا تھا
وصل ہم گزاریں گے تلخیاں مٹانے میں

بچپنے میں دوڑے تھے خواہشوں کے پیچھے ہم
اب تو عمر گزرے گی تتلیاں اڑانے میں

قربتوں نے جو لکھی، داستاں ہماری ہے
نام تک نہیں ہمدم ہجر کے فسانے میں

☆

شورشِ گردشِ ایام سے پہلے پہلے
دھوپ ڈھلتی ہے کہاں شام سے پہلے پہلے

میرے کردار پہ موقوف نہیں ہے لیکن
یہ فسانہ ہے مرے نام سے پہلے پہلے

اب وہی امن کا معیار نظر آتے ہیں
لوگ لڑتے تھے جو اسلام سے پہلے پہلے

تیری آنکھوں سے لبِ بام اترتی دیکھی
بات سمجھی ہے جو پیغام سے پہلے پہلے

کعبۂ جاں میں وہی ہم نے رفو کرنا ہے
چاک دامن ہے جو احرام سے پہلے پہلے

کرفیو کس نے سرِ عام لگا رکھا ہے
کیوں خموشی ہے یہ ہنگام سے پہلے پہلے

اپنے ہونے پہ نہ ہونے کا گماں ہوتا ہے
خود کو دیکھا ہے جو اصنام سے پہلے پہلے

خوب صورت ہیں مگر حسن کی تصویر کہاں
پھول کھلتے ہیں جو گل فام سے پہلے پہلے

سانحہ کوئی سرِ شہر ہوا چاہتا ہے
ایک آہٹ سی ہے کہرام سے پہلے پہلے

ہم سمجھتے ہیں کہ سرمایۂ جاں ہیں لوگو!
دام بڑھتے ہیں جو نیلام سے پہلے پہلے

خوب صورت سی غزل ہو گی یقیناً ہمدم
موجۂ گل ہے جو الہام سے پہلے پہلے

☆

آئینۂ ہستی میں جو دیکھیں گے کسی دن
قرطاس پہ تصویر اُتاریں گے کسی دن

رکھیں گے تجھے پھول کی خوشبو میں بسا کر
وجدان کی کلیوں میں سجائیں گے کسی دن

اِس آس پہ لکھتے ہیں محبت کی کتابیں
کچھ لوگ محبت سے خریدیں گے کسی دن

ہم پھول کی صورت ہیں نہ پتھر کی طرح ہیں
احساس کے پیکر ہیں جو ٹوٹیں گے کسی دن

چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش نہیں کرتے
ہاں گردشِ ایام سے الجھیں گے کسی دن

روٹی کو ترستے ہیں یہاں فکر کے مارے
کیا جرم ہمارا ہے؟ یہ پوچھیں گے کسی دن

کیوں ذہن محبت میں ہمارے نہیں ملتے
ہم بیچ کی دیوار پہ سوچیں گے کسی دن

جو لوگ سرِ موجِ سخن جھوم رہے ہیں
ہمدم کی غزل ساز پہ چھیڑیں گے کسی دن

☆

موجِ بلا کا خوف مٹا دینا چاہیے
پھر سے کوئی چراغ جلا دینا چاہیے

دل کو کھلی کھلی سی فضا میں نکال کر
وحشت بھری گھٹن کو مٹا دینا چاہیے

ہر بے مراد گل کو نمو کی تلاش ہے
اشکِ رواں چمن میں گھلا دینا چاہیے

سوہنی جنونِ عشق میں ڈرتی نہیں میاں!
کچا گھڑا ہی کیوں نہ چھپا دینا چاہیے

رشتے بہت عظیم ہیں شہرِ خلوص کے
سچی محبتوں کا صلہ دینا چاہیے

پردہ رہے نہ آنکھ ، نہ تصویر میں کوئی
آئینہ درمیاں سے ہٹا دینا چاہیے

ہر اک جہاں کے سامنے ہے دوسرا جہاں
یہ راز اب جہاں کو بتا دینا چاہیے

اچھا ہے روپ چاند کا کالے لباس میں
لیکن کبھی کبھی تو دکھا دینا چاہیے

ہمدم صدائے عشق نے چونکا دیا مجھے
خود کو بھی راستے سے اٹھا دینا چاہیے

☆

موسمِ گل خزاں نہ ہو جائے
پھر ہوا بدگماں نہ ہو جائے

موجۂ خوں رواں نہ ہو جائے
تیشۂ دل عیاں نہ ہو جائے

اپنی کمزوریوں پہ غور کریں
کامیابی دھواں نہ ہو جائے

جھوٹ لکھا ہوا ہے چہروں پر
آئینہ ہم زباں نہ ہو جائے

اس قدر دوریاں رواج نہ کر
ہجر بھی داستاں نہ ہو جائے

ظلم پرور ! ذرا ٹھہر تو سہی
الاماں ! الاماں ! نہ ہو جائے

اس خرابے میں احتیاط ! ذرا
یوں نہ ہو، پھر زیاں نہ ہو جائے

چاک دامن رفو کریں صاحب!
زخم سکہ نشاں نہ ہو جائے

خاک زادے نہ بھاگ جائیں کہیں
خاک داں لامکاں نہ ہو جائے

بے قراری میں چین ملتا ہے
یہ سمندر گراں نہ ہو جائے

کتنی مشکل سے جاں چھڑائی تھی
پھر عدو مہرباں نہ ہو جائے

جو بھی کہنا ہے سچ کہو دل سے
یہ سخن رائگاں نہ ہو جائے

ڈر رہا ہے امیر دھرنے سے
بھیڑ یہ کارواں نہ ہو جائے

حال ایسا ہے چشمِ بینا کا
دیدۂ رفتگاں نہ ہو جائے

میں نہیں چاہتا فادمیاں!
خوں مرا ترجماں نہ ہو جائے

سوچتا ہوں دماغ سے ہمدم
دِل کہیں حکمراں نہ ہو جائے

☆

ہمارے خواب کے رستے میں گھر نہیں آیا
سفر کی شام سے پہلے نظر نہیں آیا

خیال و خواب کے سائے کا ساتھ باقی ہے
گزر گیا جو زمانہ ادھر نہیں آیا

پون پون جو مرے ساتھ ساتھ رہتا تھا
ہزار بار پکارا مگر نہیں آیا

ہوا کے دوش پہ اڑتے رہے سدا لیکن
ہمارے ہاتھ میں خواہش کا پر نہیں آیا

یہ کس کی لو نے اجالے رکھی شبِ ہجراں
چراغ بن کے ستارہ اگر نہیں آیا

سماعتوں میں دھمک ہے تو سانس میں بارود
ہمارے عہد کے حصے میں ڈر نہیں آیا

وہ جس کے بام پہ ٹھہری ہوئی تھیں دو آنکھیں
تمام شہر میں ڈھونڈا وہ در نہیں آیا

یزیدِ وقت کی گردن میں آ گیا سریا
درِ حسینؓ سے اٹھ کر وہ سر نہیں آیا

بدن کی راکھ بگولوں میں رقص کرتی رہی
ہوا کے سامنے جب تک شرر نہیں آیا

مجھے تلاش تھی جس کی نہیں ملا مجھ کو
مرے نصیب میں سچا گھر نہیں آیا

صدائے موجۂ گل نے نمود بخشی ہے
خزاں سرشت شجر پر ثمر نہیں آیا

مقام ایسا ملا ہے نیاز مندی میں
جو خود کو زیر کیا ہے زبر نہیں آیا

یہ المیہ ہے ہماری اداس بستی کا
چلا گیا جو ادھر وہ ادھر نہیں آیا

سڑک بنی ہے تو بدلا ہے گاؤں کا رستہ
پرانے موڑ پہ بوڑھا شجر نہیں آیا

تراشتا ہوں محبت سے حرف حرف مگر
سخن وری کا ابھی تک ہنر نہیں آیا

تلاشتے ہیں فرشتے زمین پر جس کو
بشر کے روپ میں کیوں کر نظر نہیں آیا

عجیب درد دیا ہے ہمیں محبت میں
تڑپتے رہ ہی گئے چارہ گر نہیں آیا

طواف کرنے لگی ہیں ہوائیں کیوں ہمدم
ابھی تو ناؤ کے آگے بھنور نہیں آیا

☆

ایسا بھی کیا کہ زندگی دشتِ بلا بھی ہو
پیشِ نظر سراب کا چہرہ کشا بھی ہو

مروہ سے بھاگ لوں کبھی زم زم کے واسطے
لیکن سعی کی راہ میں کوہِ صفا بھی ہو

کوئی تو میرا چاک گریباں رفو کرے
دامن فگار ہو کوئی موجِ صبا بھی ہو

آنچل کا سائباں رہے آنکھوں کی روشنی
پلکوں کے آس پاس وہ بندِ قبا بھی ہو

ناساز گار وقت بدلنے کی دیر ہے
ممکن ہے مشکلات کا اچھا صلہ بھی ہو

موسم ہمارے شہر کا ایسا بھی ہو کبھی
اندھی ہوا کے ہاتھ پہ جلتا دیا بھی ہو

سوہنی ! تو اپنے عشق پہ پکا یقین رکھ
شاید کسی چناب میں پکا گھڑا بھی ہو

سود و زیاں کے شہر میں جینا قبول ہے
سورج کی تیز دھوپ میں سر پر گھٹا بھی ہو

ہمدم ہوا کے ہاتھ کی دستک سنا کرو
ممکن ہے اگلی بار یہ دل کی صدا بھی ہو

☆

خواب جو برسرِ پیکار ہوا کرتے ہیں
دل کے اندر سے نمودار ہوا کرتے ہیں

یہ جو دو چار سے کردار ہوا کرتے ہیں
ہر کہانی میں اداکار ہوا کرتے ہیں

اپنے دامن کو الجھنے سے بچائے رکھنا
دل کے رستے میں کئی خار ہوا کرتے ہیں

خار زاروں پہ مچلتے ہوئے زخمی پاؤں
موجۂ گل کے طلب گار ہوا کرتے ہیں

اُن کو تعبیر کی صورت بھی کہاں ملتی ہے
خواب زدگی میں جو آزار ہوا کرتے ہیں

چاک دامن میں کوئی دستِ عدو ہوتا ہے
آستینوں میں پلے مار ہوا کرتے ہیں

ہم سے نفرت کا بکھیڑا نہیں ہوتا صاحب!
ہم محبت کے سزاوار ہوا کرتے ہیں

دائرہ اپنی محبت کا بڑھائے رکھنا
زاویے وسعتِ پرکار ہوا کرتے ہیں

ایک تصویر نئی روز پڑی ملتی ہے
کس کے ہاتھوں سے یہ سنگھار ہوا کرتے ہیں

چاک در چاک سنورنے کا ہنر جانتے ہیں
خاک زادوں میں بھی شہکار ہوا کرتے ہیں

تیشۂ دل کی مسافت ہے سنبھلنا ہمدم
وادیِ عشق میں کہسار ہوا کرتے ہیں

☆

پیش منظر میں جو اخبار ہوا کرتے ہیں
سچ کہوں جھوٹ کے انبار ہوا کرتے ہیں

خارزاروں کی ضرورت ہے نمو پا جانا
تیری آمد سے جو گلزار ہوا کرتے ہیں

دھوپ نگری میں اکیلا نہیں رہنے دیتے
کتنے سائے ہیں جو دیوار ہوا کرتے ہیں

جھوٹ پاتا ہے اندھیرے میں رہائی لیکن
فیصلے سچ کے سرِ دار ہوا کرتے ہیں

زندگی ان کے تسلط سے رہا ہوتی ہے
مرنے والے جو گنہ گار ہوا کرتے ہیں

زخم سینے پہ نہیں کوئی تو حیرت کیسی؟
پیٹھ پیچھے سے کئی وار ہوا کرتے ہیں

کچھ دیے وقت کے رستے کا پتہ دیتے ہیں
شوخ آنکھوں میں بھی اسرار ہوا کرتے ہیں

سرد لہجے میں اترتا ہے انا کا موسم
دور جانے کے بھی آثار ہوا کرتے ہیں

جب نکلتے ہیں میاں ظلِ الٰہی باہر
ساتھ کچھ حاشیہ بردار ہوا کرتے ہیں

صورتیں دیکھتا جاتا ہوں عجب نگری میں
سامنے آئینہ بردار ہوا کرتے ہیں

جن کو ملتی ہے وراثت میں حکومت ہمدم
کج کلاہی میں بھی سردار ہوا کرتے ہیں

.

☆

بکھری ہوئی کلیاں ہیں، سلگتے ہیں شرارے
ٹوٹے ہوئے پتوں کو بھلا کون بہارے

آئینہ فروشوں سے مراسم ہیں ہمارے
سو چشمِ تماشا میں سنورتے ہیں نظارے

اے کاش کوئی چاند کبھی جھیل میں اترے
آنکھوں میں اترتے ہیں محبت کے ستارے

اِن سے کبھی نفرت کی شکایت نہیں کرنا
یہ لوگ کسی کے، نہ ہمارے نہ تمہارے

یہ کوزہ گری جہد مسلسل کا سفر ہے
ہم نے بھی کئی بار یہی نقش سنوارے

ہم خواب کی صورت کسی منظر میں ملیں گے
آؤ نا! کبھی دھوپ نگر! جھیل کنارے

صدیوں کے مہاجن نے ہمیں قید رکھا ہے
آئے کوئی ایسا جو سبھی قرض اتارے

ہے لازم وملزوم رفاقت کا سفر بھی
میں ہجر گزاروں کہ مجھے ہجر گزارے

احساس کا رشتہ کبھی ٹوٹا نہیں کرتا
توڑے نہیں جا سکتے محبت کے اجارے

انسان کی قیمت سرِ بازار لگی ہے
بکتے ہیں سرِ شہر کئی راج دلارے

اے قوم کے سردار! ذرا ایک نظر دیکھ
یہ روتے، بلکتے ہوئے کچھ لوگ بچارے

شیشے کی نئی شیلف پہ ماضی نہیں سجتا
مٹی کے کھلونے ہیں نہ کاغذ کے غبارے

جی جان لگاتے ہیں جنوں زاد جوئے میں
سہتے ہیں محبت میں خساروں پہ خسارے

ہم بھی تو کہیں صفر کی مانند پڑے ہیں
اے کاش کسی طور کوئی ہم کو شمارے

الفاظ کی حرمت کو سمجھتے ہیں سو ہمدم
سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے رقیبوں کے اشارے

☆

پیش منظر آئینے میں کیا سے کیا ہو جائے گا؟
جو نظر کے سامنے ہے ماورا ہو جائے گا

میں تو سمجھا تھا کہ اپنے سامنے موجود ہوں
کیا خبر تھی آئنہ بھی دوسرا ہو جائے گا

چاک دامن عشق میں باقی رہے یا مٹ رہے
ہاں خیالِ یار میرا بوریا ہو جائے گا

رنگ لائے گا کسی دن سنگ زادوں کا لہو
دیکھنا ہر شخص اک دن سر پھرا ہو جائے گا

ایک ہنگامہ بپا ہونے کو ہے احساس میں
زلزلاتی سرزمیں پر سانحہ ہو جائے گا

سانس نکلے گی بدن سے ہچکیاں کھانے کے بعد
دو گھڑی میں زندگی کا فیصلہ ہو جائے گا

خاک دانی سے پرے ہے لامکانی کا سفر
جو فلک سے پار اترا آشنا ہو جائے گا

کون بنتا ہے سہارا سائبانی کے لیے
دھوپ نگری میں تو سایہ بے وفا ہو جائے گا

ایک وحشت پل رہی ہے زندگی کے ساتھ ساتھ
شہر سارا ہی جنوں میں مبتلا ہو جائے گا

سوچ کی پرکار کھلتی جا رہی ہے شہر میں
ایک نقطہ پھیلتے ہی دائرہ ہو جائے گا

بس ذرا سی دیر ہے، تازہ ہوا چلنے کو ہے
غنچہ غنچہ اس چمن میں ہم نوا ہو جائے گا

جھلملاتی روشنی میں تیرگی کٹ جائے گی
آنکھ میں ٹھہرا ہوا جگنو دیا ہو جائے گا

بے حسی کے ہاتھ سے چارہ گری ممکن نہیں
بڑھتے بڑھتے یہ مرض بھی لادوا ہو جائے گا

ڈوب جائے گی کوئی سوہنی چنابِ عشق میں
موج میں آیا ہوا دریا گھڑا ہو جائے گا

خود پرستی پر چنے جائیں گے مندر ذات کے
آدمی پتھر بنے گا پھر خدا ہو جائے گا

دو کنارے مل رہیں گے ریت کی دیوار پر
بیچ میں بہتا ہوا دریا فنا ہو جائے گا

دیدۂ تر ہی رکھے گا سجدۂ دل کا بھرم
ایک آنسو بھی مجھے آبِ بقا ہو جائے گا

کونپلیں سرسبز ہو جائیں گی دشتِ فکر کی
موجۂ گل سے مرا صحرا ہرا ہو جائے گا

ہم غلامانِ علیؓ مشکل کشا ہیں دوستو!
عزم اپنا سجدہ ءِ کرب و بلا ہو جائے گا

منزلیں کھو جائیں گی ہمدم غبارِ دشت میں
خواہشوں کا راستہ بھی اژدہا ہو جائے گا

☆

نکلے سرائے خواب سے وجدان بن گئے
جگنو مرے شعور کی پہچان بن گئے

اِک سنگ دل حسیں کی پرستش کو دیکھ کر
پتھر تمام شہر کے بھگوان بن گئے

کیا انقلابِ گردشِ دوراں کہیں اسے
تنکے ہوا کے زور پہ طوفان بن گئے

کھلتے گئے حروف جو دل کی زمین پر
موجِ غزل میں باعثِ دیوان بن گئے

حیواں سرشت وحشتیں بدلیں نہیں مگر
جنگل میں رہنے والے بھی انسان بن گئے

تیشہ جنونِ عشق میں ورثہ جنہیں ملا
زرخیز کھیتیوں میں وہ دہقان بن گئے

ہمدم سخن میں جن کی محبت کشید کی
سرمایۂ حیات کا عنوان بن گئے

☆

آئینۂ ادراک میں تصویر کوئی اور
ہے خواب الگ، خواب کی تعبیر کوئی اور

تصویر کوئی اور غزل گیر ہوئی ہے
کرتا ہے مرے حرف کی تفسیر کوئی اور

یہ شہرِ تصوّف ہے اسے جھنگ نہ سمجھو
رانجھا ہے کوئی اور یہاں ہیر کوئی اور

کرتا ہوں میں کچھ اور مقدر کے حوالے
دیتی ہے مرے ہاتھ کی تقدیر کوئی اور

اَنگار سلگتے ہیں چناروں کے بدن میں
خوابوں میں تراشا گیا کشمیر کوئی اور

خاموش فضاؤں میں گزارا نہیں ہوتا
اس شہر میں جینے کی ہے تدبیر کوئی اور

میں ذوقِ جنوں لے کے سرِ دار چلا تھا
پڑتی ہے مرے پاؤں میں زنجیر کوئی اور

سوئے تھے کسی اور تمنا کی طلب میں
آنکھوں میں سحر خیز ہے شب گیر کوئی اور

یہ دور یزیدوں کے شکنجے میں پھنسا ہے
اُٹھے گا اسی دشت سے شبیرؓ کوئی اور

زنداں میں وہی اہلِ جنوں قید پڑے ہیں
ہے جرم کوئی اور نہ تعزیر کوئی اور

سورج کی تمازت سے بپا ہونے لگی ہے
حالات کے تالاب میں تبخیر کوئی اور

یہ رات کے جگنو ہیں جو رستے میں پڑے ہیں
منزل کے چراغوں میں ہے تنویر کوئی اور

بدنام کسی اور طرح ہوتے گئے ہم
بڑھتی ہی گئی عشق میں توقیر کوئی اور

اِک اور ہی ترتیب سے تشکیل ہوا میں
تخریب مری اور ہے تعمیر مری اور

ہم خاک نشینوں سے تجھے کچھ نہ ملے گا
اے چشمِ ستم زاد جگر چیر کوئی اور

گرتا ہوں تو اٹھتا ہوں دوبارہ میں سنبھل کر
درپیش ہوئی زلف گرہ گیر کوئی اور

احساس کے گل دان میں وہ پھول سجا کیا
لہجے سے چھلکنے لگی تاثیر کوئی اور

اِک وار ہوا سر پہ مرے پیٹھ سے اور پھر
سینے سے نکالا نہ گیا تیر کوئی اور

دشمن کے مقابل مرا ایمان لڑے گا
ٹوٹے گی مگر جنگ میں شمشیر کوئی اور

کب تک ترے لفظوں سے تری بات بنے گی
جدت کی روایت میں اٹھا میر کوئی اور

ٹپکا ہے مری آنکھ سے پگھلا ہوا پتھر
مٹی پہ ہوا خون سے تحریر کوئی اور

اِک میں ہی جدائی میں دل و جاں سے مٹا ہوں
پایا نہ گیا ہجر میں نخچیر کوئی اور

انساں کی حقیقت نہیں معلوم کسی کو
دنیا کو دکھائی گئی تصویر کوئی اور

آنند سجایا ہے اسی شہر میں ہمدم
ہے دل کے دروں عشق کی جاگیر کوئی اور

☆

بے چراغی کا سبب موجِ ہوا جانتی ہے
کس خرابے میں بجھا دل کا دیا جانتی ہے

اپنی دستار سبک سار نہ ہونے دینا
ایسے کردار پہ تاریخ برا جانتی ہے

کتنے پیاسوں کی تمنائیں لیے چلتی ہیں
اِن ہواؤں کی حقیقت کو گھٹا جانتی ہے

مجھ کو اڑنے کی ضرورت نہیں رہتی لیکن
میری پرواز مرے دل کی فضا جانتی ہے

وہ تو پھرتا ہے محبت کا شہنشاہ ہو کر
کیسی لیلیٰ ہے جو مجنوں کو گدا جانتی ہے

عرصۂ گل پہ تھرکتی ہوئی تتلی شاید
چاک دامن میں کھلا بندِ قبا جانتی ہے

مجھ کو مہمیز کیے رکھتی ہے تیری خوشبو
میرا احساس یہی بادِ صبا جانتی ہے

کھول دیتی ہے سرِ خواب دریچہ دل کا
میری دھڑکن ترے قدموں کی صدا جانتی ہے

کون دریا میں اترتا ہے؟ ارے! عشق میاں!
اب تو سوہنی بھی محبت کا گھڑا جانتی ہے

میں ہوں بخشش کا طلب گار اگرچہ چپ ہوں
تیری رحمت تو مرا حرفِ دعا جانتی ہے

ہنس کے سہتا ہوں زمانے کے ہزاروں نشتر
زندگی دردِ مسلسل کو دوا جانتی ہے

میں ہوں انسان مجھے راز میں رکھا گیا ہے
کس کو معلوم ہے؟ دنیا مجھے کیا جانتی ہے؟

مجھ پہ لازم تھا محبت میں فنا ہو جانا
کتنا ٹوٹا ہوں فقط میری انا جانتی ہے

میرا دکھ درد سمجھتی ہے ہمیشہ ہمدم
زندگی مجھ کو کہاں خود سے جدا جانتی ہے

☆

آئنہ زاد سرابوں میں شجر کاری پر
آنکھ ٹھہری ہے سرِ خواب سحر کاری پر

اے وطن ! تیری محبت میں سخن کاری پر
حرف آنے نہ دیا ہم نے وفاداری پر

موجۂ گل میں یہی حسنِ پزیرائی ہے
رنگ مہکے ہیں گلابوں کی خریداری پر

اب کوئی اور شجر کاٹنا بنتا ہی نہیں
اس نے ڈالا ہے عجب داغ مری آری پر

دھوکہ دیتے ہیں یہاں لوگ، چلے جاتے ہیں
محوِ حیرت ہوں زمانے کی اداکاری پر

جانے کس چاند کے آنگن میں اترتے ہوں گے
آنکھ چھلکی ہے ستاروں کی ضیا باری پر

لوٹ لیتا ہے تغافل سے ہماری سانسیں
کوئی تعزیر تو ہو دل کے بیوپاری پر

میں نے تصویر میں الجھے ہوئے منظر دیکھے
آئینہ کھلنے لگا میری نگہداری پر

کون جاگا ہے چراغوں کی حفاظت کرتے؟
صبحِ نو اتری ہے شب گیر کی بیداری پر

کوک اٹھتی ہے سرِ دشت بکھر جاتی ہے
زندگی بوجھ ہوئی ہجر میں بنجاری پر

لوگ بھرتے ہیں مری چشم رسا سے آنکھیں
مے کدہ دنگ ہے ساقی مری مے خواری پر

بات ہنسنے کی میں کرتا ہوں تو رو دیتے ہیں
لوگ ہنستے ہیں عجب طرز کی فنکاری پر

کس نے چھینی ہے مرے شعر کی خوش اسلوبی؟
کس نے مجبور کیا مجھ کو عزاداری پر؟

سر جھکایا ہی نہیں میں نے کہ دیکھا ہوتا
بونا قد آگے بڑھے جب کہ مری باری پر

جو بھی کھلتا ہے وہی سرخ ہوا جاتا ہے
کس نے چھڑکا ہے لہو آس کی پھلواری پر

بے خرد ہو کے بھی رہتا ہوں مکمل ہمدم
ٹوٹ جاتا ہوں مگر دل کی طرف داری پر

☆

دیارِ شب کے دریچے سے خواب نکلے گا
یہ آگہی کا سفر ہے سراب نکلے گا

کسی کسی کو خبر ہے، سخن وری کیا ہے؟
کوئی کوئی ہے جو اہلِ کتاب نکلے گا

نوائے میرؔ نہ غالبؔ کی آگہی صاحب
سرائے حرف سے کیسا نصاب نکلے گا؟

سڑک پہ یوں ہی تکلف نہیں ہے برتا گیا
بہ اہتمام وہ عزت مآب نکلے گا

بکھر گئے بھی تو کانٹے خراج مانگیں گے
کلی کلی سے شگفتہ گلاب نکلے گا

سنا تھا عشق ذرا امتحان لیتا ہے
خبر نہیں تھی کہ اتنا خراب نکلے گا

مرا ہی نام رہے گا ترے خسارے میں
میں جانتا ہوں مرا ہی حساب نکلے گا

سبھی سوال سمجھتی ہیں دھڑکنیں دل کی
نظر سوال کرے گی ، جواب نکلے گا

چھلک پڑے گا کسی کا حجاب آنکھوں سے
حسین رنگ جو زیرِ نقاب نکلے گا

نظر تو آئے گا لیکن کبھی کھلے گا نہیں
ہماری پیاس کا ساگر سحاب نکلے گا

کسی کی کوک بھٹکتی رہے گی صحرا میں
کسی کے عشق کا دریا چناب نکلے گا

اندھیری رات تھمے گی یہیں پہ صبحِ دم
اِسی سفر میں نیا آفتاب نکلے گا

کبھی تو رنگ دکھائے گی جل پری اپنا
کبھی تو جھیل سے وہ ماہتاب نکلے گا

خرد سے کام رہے گا کسے زمانے میں؟
یونہی جنوں سے اگر اضطراب نکلے گا

بدل رہا ہے زمانہ گھڑی گھڑی لیکن
دل و دماغ سے کب انقلاب نکلے گا؟

پون پون میں سمائے ہے موجۂ فردا
جہانِ درد سے دل کامیاب نکلے گا

محبتوں کی عبادت کو عام ہونے دو
یہی گناہ تو کارِ ثواب نکلے گا

ترے لیے میں سراپا غزل ہوا ہمدم
کتابِ دل سے ترا انتساب نکلے گا

☆

آنکھیں ہیں کوئی اور نہ خواب اور طرح کے
درپیش ہیں صحرا میں سراب اور طرح کے

رکھتے ہیں جو چہرے پہ نقاب اور طرح کے
پردے میں دکھاتے ہیں حجاب اور طرح کے

احساس کا غنچہ ہے بہاروں کا تبسم
خوشبو کا ترنم ہیں گلاب اور طرح کے

اِس بار حقیقت ہے ذرا اور طرح کی
اس بار مسائل ہیں جناب اور طرح کے

سچے ہیں مگر جھوٹ کے میزان پہ آ کر
ملتے ہیں سوالوں کے جواب اور طرح کے

وہ اور ہیں جو دل کے خریدار ہوئے ہیں
لٹتے ہیں سرِعام شباب اور طرح کے

رندوں سے کسی کو بھی شکایت نہیں ہو گی
پائیں گے گنہ گار ثواب اور طرح کے

یہ شہرِ تمنا ہے یہاں بھوک بہت ہے
بیٹھے ہیں یہاں خانہ خراب اور طرح کے

یوں ہی تو کوئی خود پہ مصیبت نہیں لاتا
آتے ہیں زمانے میں عذاب اور طرح کے

منعم کو تجارت سے ہی فرصت نہیں ملتی
باقی ہیں سرِ شہر حساب اور طرح کے

دریا کے کنارے کوئی ماہی نہیں ملتا
پڑتے ہیں محبت میں چناب اور طرح کے

یہ بھی تو زمانہ ہے کہ آزاد فضا میں
چڑیوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب اور طرح کے

بکھرے ہوئے بادل ہیں گرجتے ہی رہیں گے
بارش کا وسیلہ ہیں سحاب اور طرح کے

فتوے میں کوئی خیر کا پہلو بھی تو نکلے
سنتے ہیں مساجد میں خطاب اور طرح کے

چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش نہیں کرتے
ہم لوگ پجاری ہیں جناب اور طرح کے

بے سر ہیں یہاں لوگ کسے سر پہ بٹھائیں
دستار کے قابل ہیں مآب اور طرح کے

اپنوں کو پرکھنے کی ضرورت نہیں رہتی
لازم ہیں محبت میں نصاب اور طرح کے

کچھ اور دھڑکتا ہے مری سانس میں ہمدم
بجتے ہیں مرے دل میں رباب اور طرح کے

☆

نہ پوچھا زندگی کیا ہے؟ کہا؛ دو چار تو ہو گی!
جو صورت پیشِ منظر ہے؛ کبھی زنگار تو ہو گی

کہا! سورج اتارے گا کبھی اپنی تھکن بھی کیا؟
تو بولے؛ دھوپ سے آگے کوئی دیوار تو ہو گی

سوال ہم نے کیا، اے دل! سرورِ بےخودی کیا ہے؟
جواب آیا؛ محبت برسرِ پیکار تو ہو گی!

گماں کا زاویہ توڑا؛ کہا یوں بےنیازی سے
یقیناً دائرہ کاری سرِ پرکار تو ہو گی!

پکارا! کب، کہاں؟ کیسے؟ یہاں کیا ہونے والا ہے؟
ندا آئی! قیامت ہے! سبک رفتار تو ہوگی!

سوال اٹھا؛ وفاداری میں بازی کون جیتے گا؟
جواب آیا؛ جوا کھیلو! کسی کی ہار تو ہو گی!

اٹھی انگلی؛ کہا! رقصِ جنوں اچھا نہیں لگتا
صدا اٹھی؛ ارے پاگل! مری چھنکار تو ہوگی

ابھی تک بانسری بیلے میں بجتی ہے یہی کہہ کر
جہاں بھی رانجھنا ہو گا، وہاں مٹیار تو ہو گی

کسی نے خار بوئے ہیں؛ تو دامن بھر کے لے جائے
صدائے موجۂ گل ہے؛ یہاں مہکار تو ہو گی!

صبا سے پوچھنا کیسا؟ چمن میں جستجو کیسی؟
کھلی ہیں پھول کی کلیاں! اجی! مہکار تو ہوگی!

میں اپنے آپ سے پوچھا، دیارِ ہجر کا موسم؟
کھلا مجھ پر جدائی باعثِ آزار تو ہو گی!

مری آنکھیں سوالی تھیں جہانِ خواب سے آگے
تسلی آگہی نے دی سحر بیدار تو ہو گی

نظر کے طاق میں جلتے چراغوں نے یہ پوچھا ہے
ہماری روشنی بھی آئینے سے پار تو ہو گی؟

رہا شکوہ گرانی کا مگر بازار کہتا ہے
ارے ہمدم! جو سستی ہے وہ شے بے کار تو ہو گی

☆

آؤ! چوپال سجاتے ہیں گھنی چھاؤں میں
آخری پیڑ تو رہتا ہے مرے گاؤں میں

دھول اڑتی ہے تو اڑتی ہی چلی جاتی ہے
کیسی تہذیب کا رستہ ہے مرے پاؤں میں

کعبۂ دل سے نمودار ہوا ہے کوئی
گھنٹیاں بجنے لگیں کتنے کلیساؤں میں؟

کتنے مجنوں ہیں جو رہتے ہیں بہم لیلیٰ سے
کتنے یوسف ہیں جو الجھے ہیں زلیخاؤں میں؟

اپنے بندوں سے محبت وہ خدا کرتا ہے
جو محبت ہوئی تقسیم کئی ماؤں میں

پھول ہو، چاند ہو، تارہ ہو، کوئی جگنو ہو
چارہ گر کوئی تو ہو اتنے مسیحاؤں میں

اپنے احساس کی سچائی کو قائم رکھنا
تم نہ کھو جانا کہیں جھوٹی تمناؤں میں

تیشہء جاں سے کئی سنگ تراشے ہم نے
نام آئے گا ہمارا بھی تواناؤں میں

موج در موج کنارے کے تمنائی ہوئے
دل کی ناؤ نہ سنبھالی گئی دریاؤں میں

وصل کے خواب سرابوں میں نظر آنے لگے
اس قدر پھول کھلے ہجر کے صحراؤں میں

دل سے نکلے ہوئے اصنام کہاں رکھیں گے؟
اک نئی جنگ چھڑی شہر کے ملاؤں میں

جو قدم شہر کو اٹھتا ہے وہی بھاری ہے
کس نے زنجیر سی ڈالی ہے مرے پاؤں میں

سب کی آنکھوں کو عطا کی ہے حقیقت ہمدم
آئنہ بانٹ دیا میں نے شناساؤں میں

☆

ہوا رکی ہے تو اپنا دیا جلایا ہے
کسی نے حبس کا موسم بھی آزمایا ہے

نظر میں دھوپ کنارہ تھا رات سے پہلے
سحر ہوئی ہے تو پلکوں پہ خواب سایہ ہے

سجا کے رکھی ہے کاغذ پہ ایک موجِ غزل
کہیں سے حرف، کہیں سے سخن اٹھایا ہے

لکیر کھینچ رہا ہوں میں حرفِ تازہ کی
کہیں پہ نقش بنایا، کہیں مٹایا ہے

سرابِ دشت سے آگے ہے آگہی کا سفر
جنوں نے آگ کا دریا کہاں بجھایا ہے

کسی کسی کی تجارت رہی خسارے میں
کوئی کوئی ہے جو نفع کما کے لایا ہے

یہ خدّ و خال مرا عکس تو نہیں لیکن
وہ دیکھیے جو کبھی میں نہیں دکھایا ہے

یہ دشت ہے اسے کہتے ہیں عشق کی دنیا
یہاں پہ ہجر گزاروں نے گھر بنایا ہے

سرائے شہرِ تمنا میں پھول کھلتے ہیں
ہمارے خواب دریچے میں کون آیا ہے؟

یہ آئینے کی مسافت نہ طے ہوئی پھر بھی
فریب کھائے ہیں، خود کو بہت گنوایا ہے

خزاں رتوں کو دکھائیں گے بودگی اپنی
سو پال پوس کے اپنا شجر لگایا ہے

ہم اپنی راہ پہ چلتے، پہنچ گئے ہوتے
بنی بنائی ہوئی راہ نے تھکایا ہے

ہمیں سے دیکھا گیا ہے نہ جھیل کا پانی
وگرنہ چاند بہت دیر جھلملایا ہے

وہیں پہ دیکھا ہے خوشبو کو رقص کرتے ہوئے
کہیں جو پھول کوئی کھل کے مسکرایا ہے

یہ میرے من کی تپسیا چراغ جیسی ہے
تمام عمر جلا ہوں، جگر جلایا ہے

خبر ملی ہے کہ آئے گا خواب میں ہمدم
سو ہم نے خواب کے رستے میں دل بچھایا ہے

☆

روشنی دھوپ کی دنیا میں گنوایا نہ کرو
شام سے پہلے چراغوں کو جلایا نہ کرو

لینے آتے ہیں فصلوں پہ یہ دانہ پانی
یاد کے ننھے پرندوں کو اڑایا نہ کرو

مجھ کو خوابوں کے مسافر نے نصیحت کی ہے
آنکھ ٹوٹے ہوئے منظر سے ملایا نہ کرو

دل کے اندھے ہیں، بصیرت نہیں رکھنے والے
آئنہ چشم گزاروں کو دکھایا نہ کرو

یوں کتابوں کو شکستہ نہیں دیکھا جاتا
ردی فٹ پاتھ کے سینے پہ سجایا نہ کرو

نقد سودا ہے میاں! عشق خسارہ کیسا؟
سچے جذبوں کی تجارت ہے بقایا نہ کرو

سر اٹھاؤ گے کہاں؟ جھکتے چلے جاؤ گے
کج ادائی کو تو دستار بنایا نہ کرو

مل ہی جائیں گے کسی روز ہمارے آنگن
بیچ یہ سوچ کی دیوار اٹھایا نہ کرو

کرب ہو، ہجر ہو یا خواب کا پیکر ہمدم
حرف قرطاس کی آنکھوں سے چھپایا نہ کرو

☆

اک بار میں گزرا تھا ترے خواب نگر سے
اب لوگ گزرتے ہیں مری راہ گزر سے

قرطاس کے سینے پہ نمودار ہوا ہے
یہ حرف کشیدہ ہے مرے دیدہء تر سے

سائے کی تمازت سے بچانے مجھے آؤ
سورج نے پکارا ہے مجھے دھوپ نگر سے

میں خاک نشینوں کی محبت میں جیا ہوں
نسبت ہے مری خاص کسی خاک بسر سے

یہ آگ کہیں اور نہیں گھر سے لگی ہے
اٹھتا ہے دھواں راکھ میں پوشیدہ شرر سے

ورنہ میں سمندر کے کنارے پہ نہ رہتا
دیکھا ہی نہیں تو نے مجھے گہری نظر سے

آنکھوں میں سماتا ہی نہیں جھیل کا منظر
اترا ہے کوئی رنگ سرِ آب قمر سے

سوکھی ہوئی لکڑی پہ بہاریں نہیں آتیں
اشجار کو توقیر ملی برگ و ثمر سے

حالات کے برزخ نے سخن سوز کیا ہے
لگتی ہے مجھے آگ عجب تازہ خبر سے

اوقات بدلنے میں زمانہ نہیں لگتا
الجھا ہی نہیں وقت کسی سینہ سپر سے

یہ میل ملاقات، محبت کا تعلق
اخلاص کی چائے ہے اسی شیر و شکر سے

ناطق ہیں نہ واجب ہیں جو تفریق ہوئے ہیں
اعداد نکلتے ہوئے مخلوط کسر سے

آنکھوں میں وہی خواب، وہی دھول جمی ہے
اُک قافلہ گزرا تھا سرِ شہر ادھر سے

میں کوزۂ ادراک کی مٹی میں پڑا ہوں
ہے کوزہ گری اور مرے دستِ ہنر سے

کچھ خواب سے ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں پڑے تھے
کیا اور نکلنا تھا سرِ شہر کھنڈر سے

میں خواب جزیرے کا مسافر تو نہیں ہوں
طوفان ملاتا ہے مری ناؤ بھنور سے

تاریک فضاؤں سے نکلتا ہے سویرا
بجھتا ہے دیا روز مرا نورِ سحر سے

اَفلاک سے آگے میں بلندی پہ اڑا ہوں
پرواز رہی ہے مری سرخاب کے پر سے

احساس کی دنیا کا سفر کرنے لگا ہوں
تصویر بناتی ہوئی دیوار میں در سے

کیا بوجھ قبیلے نے مرے سر پہ رکھا ہے
دستار سنبھالی نہیں جاتی مرے سر سے

سبزہ ہے سرِ خواب تری دید سے ہمدم
تازہ ہے مرے دل کی زمیں تیری نظر سے

☆

پیش منظر زندگی کا آئینہ ہوتا نہیں
دیکھنا پڑتا ہے جو کچھ دیکھنا ہوتا نہیں

کھینچ لاتا ہوں لکیریں سینۂ قرطاس پر
حرفِ تازہ آگہی سے ماورا ہوتا نہیں

تجھ کو اپنے آپ میں لا کر فنا ہوتا ہوں میں
ایک تو ہوتا ہے گویا دوسرا ہوتا نہیں

ایک تجھ کو مان کر کیوں دوسرے کی بات ہو
ماسوا کے بعد کوئی ماسوا ہوتا نہیں

کوفیوں سے خاص نسبت ہے صفِ احباب کو
اِس قبیلے میں کوئی اہلِ وفا ہوتا نہیں

بے یقینی ہے گماں، ایسا کبھی سوچا نہ تھا
ہونے لگتا ہے یہاں پر جو ہوا ہوتا نہیں

ہم سفر سائے کی گہری دوستی سورج سے ہے
دھوپ نگری میں کبھی مجھ سے جدا ہوتا نہیں

زاویہ بنتا نہیں ہے ان کھلی پرکار سے
بے ردا سی میں مکمل دائرہ ہوتا نہیں

پار لگتا ہے کہاں کوئی سفینہ اس طرح
ڈوبتی ہیں کشتیاں جب ناخدا ہوتا نہیں

پارسائی سے پتہ چلتا ہے باکردار کا
نارسائی میں کوئی بھی پارسا ہوتا نہیں

کچھ ہوائیں لازمی ہیں زندگی کے واسطے
ہر بگولا آندھیوں میں اژدہا ہوتا نہیں

گردشِ ایّام تو انسان کا معمول ہے
شام ہو جانا سحر کا ارتقا ہوتا نہیں

سرد پڑ جاتی ہے جینے کی تمنا دیکھنا
آرزو کے طاقچے میں جب دیا ہوتا نہیں

ہجر لاتا ہے دیارِ عشق میں مجبوریاں
یوں بچھڑ جانے سے کوئی بے وفا ہوتا نہیں

ہر خوشی بے کیف رہتی ہے جہانِ درد میں
جب تلک انسان غم سے آشنا ہوتا نہیں

ایک سی چیزیں یہاں پر ایک جیسے دام ہیں
اِس خرابے میں کوئی کھوٹا کھرا ہوتا نہیں

ربط لازم ہے شجر سے باریابی کے لیے
جو خزاں میں گر گیا، پتا ہرا ہوتا نہیں

ہر کوئی قصرِ فقیری سے گزرتا ہے کہاں
ہر کسی کے پاس حنا کی بوریا ہوتا نہیں

جوڑتا ہوں دوستی کا سلسلہ ہمدم اگر
میں محبت کی اسیری سے رہا ہوتا نہیں

☆

سرائے خواب سے آگے سراب چہرے تھے
یہ اور بات نظر میں گلاب کھلتے تھے

مرا نصیب رہا کہ حروف پڑھتا گیا
جو آئنے بھی ملے وہ کتاب جیسے تھے

سخن سرائے میں سجتی تھی محفلِ خوباں
حسین لوگ نظر سے کلام کرتے تھے

ہمیں خیال نہیں تھا کسی خسارے کا
دیارِ عشق میں ہم بھی نواب ایسے تھے

منافقت کے لبادے کو چاک چاک کیا
اُتار پھینک دیے ہیں، خراب چھلکے تھے

یہ کون لوگ تھے مٹی کو بانٹنے والے
قدم قدم پہ وفا کا حساب رکھتے تھے

عدو نے آ کے بڑھائی ہیں نفرتیں ورنہ
محبتوں کے پرانے نصاب سچے تھے

چراغ بکنے لگے جو اندھیر نگری میں
چڑھے تھے دام اجالوں کے خواب مہنگے تھے

سحر نواز ہوا تھا وہ خواب کا عالم
سیاہی چھٹنے لگی تھی سحاب اترے تھے

میں کیسے گھور اندھیرے کو صبحِ نو لکھتا
سفید چہروں پہ سارے نقاب کالے تھے

شبِ وصال محبت شعار بھول گئے
دیارِ ہجر میں کتنے عذاب جھیلے تھے

وہ ہجر کچے گھڑے پر عبور کرنا تھا
ہمارے سامنے دریا چناب جیسے تھے

جلا تھا ایک ہی خیمہ بلا کے میداں میں
پھر اس کے بعد وہاں بے حساب خیمے تھے

پگھل رہا تھا میں سورج کے ساتھ ساتھ مگر
سفر کی دھوپ میں کچھ ہم رکاب سائے تھے

وہ بے خودی کا زمانہ عجیب تھا ہمدم
سوال تجھ پہ ہوئے تھے جواب میرے تھے

☆

خاک، پانی، روشنی کا سلسلہ کیونکر ہوا؟
پیشِ منظر آ گہی کا آئنہ کیونکر ہوا؟

بر سرِ موجِ تمنا تیری جانب چلا
ہم کناروں سے گریزاں راستہ کیونکر ہوا؟

اور بھی تو لوگ تھے شہرِ وفا میں سرگراں
طے ہمیں سے ہجرتوں کا مرحلہ کیونکر ہوا؟

اِک خلش مجھ کو سرِ ہجراں ہمیشہ سے رہی
مجھ سے ایسی زندگی کا فیصلہ کیونکر ہوا؟

عشق زادے جس یقیں پر ناز کرتے تھے کبھی
عین دریا میں وہی کچا گھڑا کیونکر ہوا؟

سانس کی ڈوری کا رشتہ خواب جیسا ہے مگر
زندگی سے آدمی ہم قافیہ کیونکر ہوا؟

کھنچتی جاتی ہیں لکیریں سینۂ قرطاس پر
زاویہ در زاویہ یہ دائرہ کیونکر ہوا؟

آئینے کو دیکھ کر وہ آج تک حیران ہے
آدمی پر آگہی کا معجزہ کیونکر ہوا؟

مار ڈالا تھا جنہیں تہذیب کی تاریخ نے
ایسے لوگوں کا دوبارہ تذکرہ کیونکر ہوا؟

کیوں نکلنا پڑ رہا ہے کوچۂ ادراک سے
اندرونِ ذات ہمدم تخلیہ کیونکر ہوا؟

☆

کہسارِ شب سے برف پگھلنے کی دیر تھی
بس ایک ماہتاب نکلنے کی دیر تھی

کتنے دیے ہواؤں کے در پر سلگ اٹھے
گویا مرا چراغ نہ جلنے کی دیر تھی

دونوں کے بیچ فاصلہ کچھ بھی نہیں رہا
منزل کا راستہ ہی بدلنے کی دیر تھی

پھر اس کے بعد زندگی آرام سے کٹی
گر گر کے راستے میں سنبھلنے کی دیر تھی

سایہ بھی تیز دھوپ سے آگے لگا ہمیں
سورج کے سنگ سنگ ہی چلنے کی دیر تھی

خوابوں کے اک ہجوم نے پاؤں پکڑ لیے
میلے میں تھوڑی دیر مچلنے کی دیر تھی

خوشبو تمام شہر میں مہکی، بکھر گئی
تتلی کے رنگ پھول میں ڈھلنے کی دیر تھی

پھر یوں ہوا کہ مجھ کو سمندر نے آ لیا
موجوں کے درمیان اچھلنے کی دیر تھی

بکھرے ہوئے وجود میں اتری ہیں کرچیاں
شیشے پہ میرا پاؤں پھسلنے کی دیر تھی

ایسا لگا کہ روشنی مٹھی میں آ گئی
جگنو کا ایک پر ہی مسلنے کی دیر تھی

دیکھا تو حرف حرف کی تصویر کھنچ گئی
قرطاس پر لہو سے نکلنے کی دیر تھی

شعلوں نے میرے گھر کو شراروں پہ رکھ لیا
ہمدم پرائی آگ میں جلنے کی دیر تھی

☆

سفر کی بند گلی سے گزرنے لگتے ہیں
دیارِ شب میں ستارے اترنے لگتے ہیں

ہماری کوزہ گری ہے یہ زندگی لیکن
ہم اپنے عہد سے کیوں کر مکرنے لگتے ہیں

وہ چاندرات کا منظر، وہ جل پری پیکر
نظر میں جھیل کنارے ابھرنے لگتے ہیں

فضائے دشت میسر ہے عشق زادوں کو
یہاں تو بگڑے ہوئے بھی سدھرنے لگتے ہیں

شعورِ حرفِ تخیل سے خون مانگتا ہے
نئی زمین پہ پاؤں جو دھرنے لگتے ہیں

کسی سے پیار میں جب انتہا کو چھو جائیں
ہم اپنے آپ سے بھی عشق کرنے لگتے ہیں

شب وصال سے لیتے ہیں خواب کا پانی
شگافِ ہجر کو مٹی سے بھرنے لگتے ہیں

فریب کھائے ہوئے ہیں یہ لوگ صدیوں سے
اسی لیے تو محبت سے ڈرنے لگتے ہیں

جنونِ عشق کی شدت میں ہم وفا پیشہ
دیارِ ہجر سے پہلے ہی مرنے لگتے ہیں

سو بار بار گزرتے ہیں اس گلی سے ہم
پھر اس کے بعد جہاں سے گزرنے لگتے ہیں

کرن کرن سے نکھرتا ہے عکسِ موجۂ گل
کلی کلی پہ ستارے بکھرنے لگتے ہیں

میں خدّ و خال سجاتا ہوں اس قدر ہمدم
کہ آئینے مجھے دیکھے سنورنے لگتے ہیں

☆

پیش منظر ہے مگر خواب دکھائے کوئی
چشمِ ادراک ذرا ساتھ ملائے کوئی

دن گزرتا ہے سرِ ہجر پریشانی میں
شام ڈھلتے ہی در و بام پہ آئے کوئی

یہ خرابہ ہے یہاں کون وفا کرتا ہے؟
شہر میں خود کو تماشا نہ بنائے کوئی

شکر ہے ان کے سبب؛ میرے گنہ جھڑتے ہیں
غیبتی لوگ ہیں، باتوں پہ نہ جائے کوئی

میں زمانے کو سرِ عام اٹھا لایا ہوں
مصرعۂ تر ہے مری بات اٹھائے کوئی

میری آنکھوں نے محبت کی ضیا مانگی ہے
آٹھواں رنگ مرے دل میں سمائے کوئی

اب تو پلکوں پہ بھی جالے ہیں انا زادوں کے
اب تو آباد کرے خواب سرائے کوئی

دستکیں دیتی ہوئی موجِ ہوا نے چھیڑا
ان چراغوں کو سرِ شام جلائے کوئی

آخری رات ہے کل ہوگا بچھڑنا شاید
دل سے اٹھتی ہے صدا اور ہی ہائے! کوئی

موجۂ باد مگر بات کہاں سنتی ہے؟
پھول کہتے ہیں کہ خوشبو نہ چرائے کوئی

ایک ہی گھر ہے دوبارہ بھی تو مل سکتے ہیں
بیچ میں سوچ کی دیوار گرائے کوئی

مجھ علاقے کی محبت کا تقاضا یہ ہے
دل میں اک بار جو آئے تو نہ جائے کوئی

آنکھ جلتے ہوئے سورج سے ملا بیٹھے ہیں
چھین سکتا ہے درختوں سے بھی سائے کوئی

شہر کا شہر ہی نقاد بنا پھرتا ہے
یا الٰہی مجھے فتووں سے بچائے کوئی

ہم پہ لازم ہے کڑا عہد نبھانا ہمدم
بیج بوئے تھے کسی اور نے کھائے کوئی

☆

بدن کی خاک اڑے گی، غبار ٹھہرے گا
تو کیا یہ دشت ہمارا دیار ٹھہرے گا؟

یہ روشنی کا سفر ہے فریبِ شب تو نہیں
چراغ جلتے رہے تو قرار ٹھہرے گا

ہمارے ساتھ کوئی غیر چل نہیں سکتا
ہمارے ساتھ کوئی ہم شعار ٹھہرے گا

سنا ہے یونہی قیامت اٹھائی جائے گی
سنا ہے یونہی کسی دن مدار ٹھہرے گا

بچا بچا کے رکھا ہے فگار سینہ بھی
سو دیکھتے ہیں یہ کس کا شکار ٹھہرے گا

عجیب رنگ دکھاتا ہے پیش منظر میں
یہ آئینہ بھی فسانہ نگار ٹھہرے گا

شبِ وصال! کسی مہ جبیں کی آنکھوں میں
کرن کرن سے الجھتا فشار ٹھہرے گا

جو رقص جسم کے اندر ہے کون دیکھتا ہے؟
ہوس اٹھے گی، تھرکتا خمار ٹھہرے گا

تمھیں ہی پیار سے دیکھیں گے دیکھنے والے
نظر نظر میں تمھارا ہی پیار ٹھہرے گا

خمیر کھینچ ہی لیتا ہے اپنے پیکر کو
زمین زاد کہاں بے کنار ٹھہرے گا

عبث ہے اپنے قبیلے کا رہ نما ہونا
یہ قافلہ تو سدا بے مہار ٹھہرے گا

پکارتا ہے ہواؤں کو سرد لہجے میں
یہ برف زاد جلا تو چنار ٹھہرے گا

تجھے خبر ہی نہیں کہ نرا خسارہ ہے
یہ زر، زمین کا سودا بے کار ٹھہرے گا

ہمارے حال پہ انگلی اٹھانے والے سن!
ہمارا عہد بہت یادگار ٹھہرے گا

بگڑ گیا جو زمانے کے ہاتھ سے پتھر
عجب نہیں کہ وہی شاہکار ٹھہرے گا

ادھر ادا، کہ رہے مبتلا مریضِ غم
ادھر یہ فکر، کہ کب تک بخار ٹھہرے گا

کوئی کوئی ہے جو ہمدم یہ پھول کاڑھ سکے
کسی کسی کا قلم نو بہار ٹھہرے گا

☆

آئینۂ جاں عشق سے آباد رہے گا
یہ دل کا فسانہ ہے طبع زاد رہے گا

الفت میں کتابوں کی ضرورت نہیں رہتی
یہ علم لدنی ہے ؛ سدا یاد رہے گا

جلتا ہے دیا دھول کے طوفان سے آگے
مٹی کا دھواں ہے جو سرِ باد رہے گا

اس شہر نے غیروں کی حکومت نہیں دیکھی
اس شہر میں ہر شخص انا زاد رہے گا

ہر ایک نے جانا ہے یہاں عہد نبھا کر
رہتا ہے بھلا کون مرے بعد رہے گا

احساس کو چھوتے ہوئے الفاظ اٹھیں گے
محفل میں کوئی شعر نہ بے داد رہے گا

اک میں ہی اکیلا تو نہیں دھوپ نگر میں
احساس کا سایہ بھی تو ہم زاد رہے گا

میں دشتِ محبت کی فضاؤں میں جیا ہوں
آزاد وطن ہے مرا آزاد رہے گا

انسان کے لہجے کی چھری کاٹ رہی ہے
ایسے میں بھلا کون یہاں شاد رہے گا

میں اپنے شکاری کو لیے بھاگ رہا ہوں
گلشن میں کوئی صید نہ صیاد رہے گا

اِس بار چراغوں نے عجب ٹھان رکھی ہے
اِس بار ہواؤں کو سبق یاد رہے گا

غم حد سے گزرتا ہے تو ہو جاتا ہے مرہم
ہر درد مجھے سیلیِ استاد رہے گا

نکلیں گے اسی دشت سے کتنے ہی مسافر
ہاں قیس مگر صاحبِ اسناد رہے گا

احساس کا صحرا ہو کہ کہسارِ غمِ جاں
در پیش ہمیں تیشۂ فرہاد رہے گا

دنیا کو مری کوزہ گری یاد رہے گی
یہ میرا ہنر ورثۂ اجداد رہے گا

ہاں سنگ اٹھائیں گے کئی لوگ مسلسل
سہنے کو مگر سینۂ فولاد رہے گا

کھلتا ہے سرِ حرف جو قرطاس پہ ہمدم
یہ رنگ مرے شعر کی بنیاد رہے گا

☆

آئینۂ جہاں میں تماشا ہوا ہے کیا؟
کھنچتا ہوا نظر میں عجب دائرہ ہے کیا؟

کہتے ہیں آدمی کے مسائل ہزار ہیں
کیا عشق کے سوا بھی کوئی مسئلہ ہے کیا؟

صدیوں سے رہ رہے ہیں اسی خاک پر مگر
ذہنوں کے درمیان رہا فاصلہ ہے کیا؟

کیا تیرے میرے بیچ کوئی اور تو نہیں؟
ہم زاد یہ بتا کہ ابھی تخلیہ ہے کیا؟

آواز دیکھتا ہوں میں چھو کر خیال کو
کوئی مجھے بتائے تو یہ معجزہ ہے کیا؟

اوقات زندگی ہے تری کیا بتا مجھے
صدیوں کے راستے پہ رواں قافلہ ہے کیا؟

پانی میں خدّ و خال، بدل تو نہیں گئے
منہ دھو کے دیکھتے ہیں ذرا آئنہ ہے کیا؟

اِک حرف ''کن'' ہوا تو نمودار ہم ہوئے
ہم سے نہ پوچھیے کہ یہ ارض و سما ہے کیا؟

میں بھی تو کائنات کے اندر مقیم ہوں
میرا خدا نہیں ہے جو تیرا خدا ہے کیا؟

یہ کیا کہ سبز رنگ پہ خونی لکیر ہے
زیتون کے شجر سے اڑی فاختہ ہے کیا؟

کہتا ہوں شعر میں کہ طبیعت رواں رہے
ورنہ سخن وری سے مرا واسطہ ہے کیا؟

ہمدم خبر بھی ہے کہ ترا ذکر ہے کہاں؟
دنیا کی داستاں میں ترا تذکرہ ہے کیا؟

☆

بس ایک خواب ہے میرا خیال؛ جانے دو
یہ آئینے کا ہے سارا کمال؛ جانے دو

کسی کسی کو یہ کارِ ثواب ہوتا ہے
بڑا کٹھن ہے وفا کا سوال؛ جانے دو

دیارِ حرف میں کاغذ کے پھول کھلتے ہیں
ہوا ہے کون سخن میں نہال؟ جانے دو

سوال یہ تھا کہ روشن چراغ کون کرے؟
سو ہم چلے ہیں ستارے اجال؛ جانے دو

میں کیسے کیٹس کے لہجے میں تم سے بات کروں
نہ تم رہے نہ تمھارا جمال؛ جانے دو

یہی نہیں کہ ہمارے چراغ بجھنے لگے
ملا ہے سب کو عروج و زوال؛ جانے دو

رفو کیا ہے محبت سے چاک دامن کو
کہاں کا درد؟ کہاں کا ملال؟ جانے دو

یہی تو بات کرائیں گے رہ زنوں سے مری
یہ میرے دوست نہیں ہیں دلال؛ جانے دو

یہاں پہ نام و نسب کا ہے دھیان کس کو میاں!
یہاں پہ لوگ ہیں لالوں کے لال؛ جانے دو

سلگ رہے ہیں چناروں میں برف زادابھی
کسے خبر ہے؟ یہ اٹھتا ابال جانے دو

میں اپنے عہد سے آگے نکل رہا ہوں تو کیا؟
تمھیں نہ مار دے میرا یہ حال؛ جانے دو

ٹھہرنے دو! کہ ٹھہرنا یہاں ضروری ہے
نہ تم چلو یہ ستاروں کی چال؛ جانے دو

فریبِ موجِ تمنا میں آنے والا نہیں
ہواؤ! مجھ پہ نہ ڈالو یہ جال؛ جانے دو

کہاں لیے ہوئے چلتی ہے چاندنی میں گھٹا
ابھی ہٹاؤ نہ چہرے سے بال؛ جانے دو

ہماری پریم کہانی کوئی نئی تو نہیں
یہ ذکرِ ہجر، یہ ذکرِ وصال؛ جانے دو

یہ موج موج سمندر مرا کنارہ ہے
کہاں ٹھہرتی ہے اپنی اچھال؛ جانے دو

اتر رہی ہیں ابھی تک وہ ہجر کی فصلیں
ابھی تو پچھلے سمے کا ہے سال؛ جانے دو

درِ جنوں ہے یہ ہمدم، خرد کا بام نہیں
تمھارا کام نہیں قیل و قال؛ جانے دو

☆

جس کو بھی دیکھتا ہوں وہی آئینہ لگے
چھوٹی سی کائنات مجھے دائرہ لگے

ایسی منافقت ہے کہ ہر شخص ہی مجھے
اپنے مقابلے میں بڑا پارسا لگے

صحرا میں گھومتی ہے مرے دل کی داستاں
ہر انتہا کے بعد نئی ابتدا لگے

مانا کہ تیز دھوپ میں ملنا محال ہے
سایہ مرے وجود کا کیوں نارسا لگے

خوشبو گزر رہی ہے نمودِ حیات سے
موجِ نمو کا راز مجھے ارتقا لگے

دل پر ابھی وہ پہلی محبت سوار ہے
ایسا بھی کیا کہ عشق مجھے دوسرا لگے

مجھ کو نگل رہا ہے جو گرد و غبار میں
جنگل کا راستہ بھی مجھے اژدہا لگے

دل ہے کہ قتل گاہ میں جلتا چراغ ہے
یہ خانماں خراب مجھے سرپھرا لگے

میں اس کی اک ادا بھی نہ تصویر کر سکوں
وہ خود نگارِ حسن مجھے اپسرا لگے

دیوار پر چلا ہے محبت کی موج میں
کیسے ہوا کے ہاتھ یہ جلتا دیا لگے

اچھا ہے اس کمان سے جو پیٹھ پر رہے
دشمن کا ایک تیر جو سینے پہ آ لگے

ہمدم دل و نظر کو اسی کی تلاش ہے
شہر خیال و خواب سے جو ماورا لگے

☆

آئینۂ جہاں میں نہ پیش نظر ملے
ہم جیسے خواب زاد کہاں اپنے گھر ملے

پاؤں تلے زمیں تھی نہ سر پر تھا آسماں
پرواز کے لیے جو ہمیں بال و پر ملے

تم سا نہ غم گسار کوئی عمر بھر ملا
کہنے کو زندگی میں بہت چارہ گر ملے

منزل کی جستجو ہے نہ سنگِ نشاں کوئی
کیا ایسی رہ گزر پہ کوئی ہم سفر ملے

شوکیس میں سجے تھے حسینوں کے پائے زار
فٹ پاتھ پر کتاب کے لعل و گہر ملے

ہم نے خزاں کے پار بھی دیکھا ہے جھانک کر
احساس کے دروں بھی وہی برگ و بر ملے

ہم نے عجب حصار میں عمریں گزار دیں
کھڑکی کھلی ملی نہ حویلی کے در ملے

سولی پہ آ گئے ہیں جو دستار چھوڑ کر
ان سرپھروں سے آ کے کوئی معتبر ملے

ایسی منافقت کا چلن ہے کہ شہر میں
چھلکوں کا رنگ روپ سجائے ثمر ملے

خواہش ہے ایک عمر سے پختہ مکان کی
شیشے کی کائنات میں پتھر کا گھر ملے

سائے کی آرزو میں سفر کر رہے ہیں ہم
سورج کے راستے میں کوئی تو شجر ملے

ہمدم انا کے موڑ پہ رکنا عذاب تھا
ایسے جدا ہوئے کہ نہ پھر عمر بھر ملے

☆

آئینۂ جاں، خواب کا پیکر نہ ملے گا
احساس کے صحرا میں سمندر نہ ملے گا

پرواز مری دل کی فضاؤں میں رہے گی
اُڑتی ہوئی کونجوں سے مرا پر نہ ملے گا

دل مصر کے بازار سے گزرا ہی نہیں ہے
خواہش کی زلیخا کو یہ خود سر نہ ملے گا

قامت مری دیکھو گے اگر دھوپ نگر میں
سایہ بھی مرے جسم برابر نہ ملے گا

اس جنگ میں غیرت ہی علم زاد رہے گی
تاجِ سرِ دارا کو سکندر نہ ملے گا

کیوں عشق کے میلے میں خرد جھوم رہا ہے
دھمال کی دم دم میں قلندر نہ ملے گا

ادراک کی پرکار سے کیا کھینچ رہے ہو
بے ربط لکیروں سے مقدر نہ ملے گا

ہر پیڑ نے موسم کی قبا اوڑھ رکھی ہے
ان برف پہاڑوں میں صنوبر نہ ملے گا

پالا تھا عدو جس نے اسے کاٹ چکا ہوں
کیا اور کسی ہاتھ میں خنجر نہ ملے گا

بازار کے بھاؤ کو پرکھنا نہیں سوہنی!
بک جائے گا اک بار تو زیور نہ ملے گا

کس دور کے لوگوں میں وفا ڈھونڈ رہے ہو
یہ سانپ کا مسکن ہے، کبوتر نہ ملے گا

تاریخ کے پرچے میں وفادار امر ہے
کردار کے زیرو کو یہ نمبر نہ ملے گا

ہنگامۂ فردا نے صفیں باندھ رکھی ہیں
میدان سے بھاگا ہوا لشکر نہ ملے گا

یہ جرم تو دستار کے شملے میں چھپا ہے
مجرم کو تلاشو گے تو کالر نہ ملے گا

سمجھے گا زمانے کو فقط دیدۂ بینا
بے نور چراغوں کو یہ جوہر نہ ملے گا

ہر باغ میں چاہت کے نئے پھول کھلیں گے
یہ زارِ محبت ہے جو بنجر نہ ملے گا

ہر دور کے انساں کو وحی بھیج رہا ہے
دل سا بھی محبت کا پیمبر نہ ملے گا

یہ ہاتھ قلم کر دیے جائیں گے تو ہمدم
قرطاس کے سینے پہ یہ نشتر نہ ملے گا

کیوں میرنوائی میں پریشان ہو ہمدم
غالبؔ سا زمانے میں سخن ور نہ ملے گا


میں کہانی میں کوئی بھولا ہوا کردار ہوں
تو نے یہ کس باب میں او! صاحب! رکھا مجھے